© rasailojaraid.com

مقالات

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

(۲)

میں اپنی تلاش و تحقیق سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ اخلاق کے لیے صرف ایک ہی بنیاد صحیح ہے اور وہ اسلام فراہم کرتا ہے۔ یہاں فلسفۂ اخلاق کے تمام بنیادی سوالات کا جواب ہم کو ملتا ہے اور ایسا جواب ملتا ہے جس کے اندر وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جو فلسفیانہ جوابات میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں مذہبی اخلاقیات کی اُن کمزوریوں میں سے بھی کوئی کمزوری موجود نہیں ہے جن کی وجہ سے وہ نہ کسی مستحکم سیرت کی تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ انسان کو تمدن کی وسیع ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہمہ گیر اخلاقی رہنمائی ملتی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کے انتہائی ممکن درجات تک ہمیں لے جا سکتی ہے۔ یہاں وہ اخلاقی اصول ہم کو ملتے ہیں جن پر ایک صالح ترین نظامِ تمدن قائم ہو سکتا ہے اور اگر ان اصولوں پر انفرادی و اجتماعی کردار کی بنا رکھی جائے تو انسانی زندگی اُس فساد سے محفوظ رہ سکتی ہے جس سے وہ اِس وقت دوچار ہے۔ اس نتیجہ پر میں کن دلائل سے پہنچا ہوں؟ اِس کی مختصر تشریح میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

فلسفہ جس مقام سے اپنی اخلاقی بحث شروع کرتا ہے، درحقیقت وہ اخلاق کے مسئلے کا سرا نہیں ہے بلکہ بیچ کے چند نقطے ہیں جنھیں سرے کو چھوڑ کر اس نے نقطۂ آغاز بنا لیا ہے اور یہی اس کی پہلی غلطی ہے۔ یہ سوال کہ انسان کے لیے کردار کی صحت و غلطی کا معیار کیا ہے اور وہ کونسی بھلائی ہے جس کو پہنچنے کی سعی انسان کے لیے مقصود بالذات ہونی چاہیے، دراصل بعد کا سوال ہے، اس سے پہلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو سوال حل ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے۔ یہ سوال اس لیے تمام سوالات پر مقدم ہے کہ حیثیت کے تعین کے بغیر اخلاق کا سوال محض بے معنی ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اس میں بیشتر امکان اسی امر کا ہوتا ہے کہ اس طرح جو اخلاقیات متعین کیے جائیں گے وہ بنیادی طور پر غلط ہوں گے۔ مثلاً کسی جائیداد کے متعلق آپ کو یہ طے کرنا ہے کہ اس میں کس طرح مجھے کام کرنا چاہیے اور کس قسم کے تصرفات میرے لیے حق ہیں اور کس قسم کے تصرفات باطل۔ کیا آپ اس سوال کو صحیح طور پر حل کر سکتے ہیں تاوقتیکہ پہلے اس بات کا تعین نہ کر لیں کہ اس جائیداد سے آپ کی حیثیت کیا ہے اور اس سے آپ کے تعلق کی کیا نوعیت ہے؟ اگر یہ جائیداد کسی دوسرے کی ملکیت ہے اور آپ اس میں امین کی حیثیت رکھتے ہیں تو آپ کے لیے اس میں اخلاقی طرز عمل کی نوعیت کچھ اور ہوگی اور اگر آپ خود اس کے مالک ہیں اور اس پر آپ کے مالکانہ اختیارات غیر محدود ہیں تو آپ کے اخلاقی طرز عمل کی نوعیت بالکل دوسری ہو جائے گی۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ حیثیت کا سوال اخلاقی طرز عمل کی نوعیت کے معاملہ میں فیصلہ کن ہے، بلکہ درحقیقت اسی پر اسی پر اس امر کے فیصلہ کا بھی انحصار ہے کہ اس جائداد میں آپ کے لیے صحیح طرز عمل متعین کرنے کا حق دار کون ہے، آپ خود یا وہ جس کے آپ امین ہیں۔

اسلام سب سے پہلے اسی سوال کی طرف توجہ کرتا ہے اور ہمیں بالکل واضح طور پر ہر شائبۂ اشتباہ کے بغیر یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت خدا کے بندے اور نائب کی ہے۔ یہاں انسان کو جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے، وہ سب خدا کی ملک ہیں، حتیٰ کہ انسان کا اپنا جسم اور وہ تمام قوتیں بھی جو اس جسم میں بھری ہوئی ہیں، انسان کی اپنی ملک نہیں ہیں بلکہ خدا کی ملک ہیں۔ خدا نے اس کو ان تمام چیزوں پر تصرف کرنے کے اختیارات دے کر یہاں اپنے نائب کی حیثیت سے مامور کیا ہے، اور اس ماموریت میں اس کا امتحان ہے۔ امتحان کا آخری نتیجہ اس دنیا میں نہیں نکلے گا بلکہ جب افراد کا، قوموں کا اور پوری نوعِ انسانی کا کام ختم ہو چکے گا اور انسانوں کی مساعی کے اثرات و نتائج پایۂ تکمیل کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہنچ جائیں گے، تب خدا ٹھیک ٹھیک ان سب کا حساب لے گا اور اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ کس نے اس کی بندگی اور نیابت کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کیا ہے اور کس نے نہیں کیا۔ یہ امتحان کسی ایک امر میں نہیں بلکہ تمام امور میں ہے۔ کسی ایک شعبۂ زندگی میں نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی پوری زندگی میں ہے۔ نفس جسم کی جتنی قوتیں انسان کو دی گئی ہیں، سب کا امتحان ہے۔ اور خارج میں جن جن چیزوں پر جس جس طرح کے اختیارات اسے عطا کیے گئے ہیں، ان سب میں بھی امتحان ہے کہ وہ کس طرح ان پر اپنا اختیار استعمال کرتا ہے۔

حیثیت کے اس تعین کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں اپنے لیے اخلاقی طرز عمل کے تعین کا حق ہی سرے سے انسان کو حاصل نہیں رہتا بلکہ اس کا فیصلہ کرنا خدا کا حق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فلسفۂ اخلاق کے وہ تمام سوالات جن کو فلسفیوں نے چھیڑا ہے، نہ صرف یہ کہ حل ہو جاتے ہیں بلکہ اس امر کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ایک ایک سوال کے بیسیوں جوابات ہوں اور ایک ایک جواب انسانوں کا ایک ایک گروہ اخلاق کے ایک جداگانہ رُخ پر چل پڑے اور ایک ہی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رہتے ہوئے یہ مختلف راستوں پر چلنے والے لوگ اپنی بے راہ رویوں سے بدنظمی، انتشار اور فساد برپا کریں۔ اگر انسان کی اُس حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے جو اسلام نے قرار دی ہے تو یہ بات خود متعین ہو جاتی ہے کہ خدا کے امتحان میں کامیاب ہونا اور اس کی رضا کو پہنچنا ہی وہ بلند ترین بھلائی ہے جو مقصود بالذات ہونی چاہیے، اور کسی طرز عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا مدار اسی امر پر ہے کہ وہ اس بھلائی کے حصول میں کہاں تک مددگار یا مانع ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی بہ نفسہٖ متعین ہو جاتی ہے کہ انسان کے لیے نیک و بد، صحیح اور غلط کے علم کا اصل ماخذ خدا کی ہدایت ہے اور اس کے سوا دوسرے ذرائع علم اس اصل ماخذ کے مددگار تو بن سکتے ہیں مگر خود اصل ماخذ نہیں بن سکتے۔ نیز یہ کہ قانون اخلاق کے لیے اصل اقتدار (Sanction) خدا کی ہے؛ اور یہ بھی کہ اچھے اخلاق کی پابندی اور بُرے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک خدا کی محبت، اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رضا کی طلب اور اس کی ناراضی کا خوف ہونا چاہیے۔

پھر نہ صرف یہ کہ اس سے فلسفۂ اخلاق کے سارے اصولی سوالات حل ہو جاتے ہیں بلکہ درحقیقت اس بنیاد پر جو اخلاقی سسٹم بنتا ہے اس کے اندر نہایت متوازن اور متناسب طریقے سے وہ تمام اخلاقی سسٹم اپنی اپنی موزوں جگہ پا لیتے ہیں جو فلسفۂ اخلاق کے مفکرین نے تجویز کیے ہیں۔ فلسفیانہ اخلاقی نظاموں کی اصل قباحت یہ نہیں ہے کہ ان میں حقیقت و صداقت کا کوئی جزء بھی نہیں ہے، بلکہ ان کی اصلی قباحت یہ ہے کہ انھوں نے صداقت کے ایک جزء کو لے کر پوری صداقت بنا لیا ہے اس لیے جزء کے کل بننے میں جس قدر زائد کی ضرورت پڑتی ہے اس کی تکمیل کے لیے لامحالہ انھیں باطل کے بہت سے اجزاء لینے پڑتے ہیں۔ اسلام اس کے برعکس پوری صداقت پیش کرتا ہے اور اس کل صداقت میں وہ تمام جزئی صداقتیں جذب ہو جاتی ہیں جو لوگوں کے پاس الگ الگ تھیں اور ناقص تھیں۔ یہاں خوشی کا بھی ایک مقام ہے، مگر اس سے مراد وہ خوشی و خوش حالی ہے جو خدا کے قانون کی پیروی سے اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہو، اور یہ خوشی و خوش حالی جسمانی و مادی بھی ہے، ذہنی و نفسی بھی، آرٹسٹک اور روحانی بھی۔ نیز یہ خوشی و خوش حالی فرد کی بھی ہے، جماعت کی بھی، اور تمام انسانیت کی بھی۔ ان مختلف خوشیوں میں تصادم نہیں بلکہ توافق ہے۔ یہاں کمال کا بھی ایک مقام ہے، مگر وہ کمال جو خدا کے امتحان میں سو فی صدی نمبر پانے کا مستحق ہو۔ اور یہ فرد کا، جماعت کا، قوم کا، پوری انسانیت کا، غرض سب ہی کا کمال ہے۔ صحیح اخلاقی طرزِ عمل وہ ہے جس سے ہر فرد نہ صرف خود کمال کی طرف ترقی کرے بلکہ دوسروں کی تکمیل میں بھی مددگار ہو اور کوئی کسی کی تکمیل میں مزاحم نہ ہو۔ یہاں کانٹ کے "قطعی واجب الاطاعت" (Categorical imperative) کو بھی پوری عزت کی جگہ مل جاتی ہے، اور اس جہاز کو وہ لنگر بھی مل جاتا ہے جس کے بغیر یہ فلسفہ کے دریا میں ڈگمگا رہا تھا۔ جس قطعی واجب الاطاعت قانون کا ذکر کانٹ نے کیا ہے اور جس کی وہ خود کوئی توضیح نہ کر سکا، دراصل وہ خدا کا قانون ہے۔ خدا ہی کی طرف سے اس کی صورت معیّن کی گئی ہے، خدا ہی کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے، اور اسی کی بے چون وچرا اطاعت کا نام نیکی ہے۔

اسی طرح یہاں اخلاقی خیر وشر کے علم کا جو ماخذ ہمیں بتایا گیا ہے وہ اُن دوسرے ذرائع علم کی نفی نہیں کرتا جن کی طرف فلاسفہ رجوع کرتے ہیں بلکہ ان سب کو ایک سسٹم کا جزء بنا لیتا ہے۔ البتہ وہ نفی جس چیز کی کرتا ہے وہ صرف یہ بات ہے کہ انھیں یا ان میں سے کسی ایک کو اصلی اور آخری ذریعۂ علم کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ خدا کی ہدایت کے ذریعہ سے خیر وشر کا جو علم ہمیں بخشا گیا ہے وہ اصل علم ہے؛ اور تجربی علم، قوانینِ حیات اور حالاتِ موجودہ سے استنباط کیا ہوا علم، عقلی علم، اور وجدانی علم، یہ سب اُس کے شواہد ہیں۔ جن چیزوں کو خدا کی ہدایت خیر کہتی ہے، انسانیت کا تجربہ ان کے خیر ہونے پر شہادت دیتا ہے، قوانینِ حیات اس کی تصدیق کرتے ہیں، عقل اور وجدان دونوں اس پر گواہ ہیں۔ لیکن معیارِ صداقت خدائی ہدایت ہے نہ کہ یہ ذرائع علم۔ انسانیت کے تاریخی تجربات سے، یا قوانینِ حیات سے اگر کوئی ایسا استنباط کیا جائے یا عقل اور وجدان سے کوئی ایسی رائے قائم کی جائے جو خدا کی ہدایت کے خلاف ہو تو اصل اعتبار خدا کی ہدایت کا کیا جائے گا نہ کہ اُس استنباط یا اُس رائے کا۔ ہمارے پاس علم کا ایک مستند معیار ہونے کا فائدہ ہی یہ ہے کہ ہمارے علوم میں ڈسپلن پیدا ہو اور ہم اس انارکی اور بدنظمی سے بچ جائیں جو کسی معیار کے نہ ہونے اور اعجاب کل ذی رأی برأیہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں قانونِ اخلاق کی پشتیبان قوت Sanction اور محرکات کا مسئلہ بھی اس طور پر حل ہوتا ہے کہ اس سے ان دوسری چیزوں کی نفی نہیں ہوتی جو فلسفیوں نے تجویز کی ہیں بلکہ صرف ان کی تصحیح ہو جاتی ہے اور جن غلط حدود پر وہ پھیلا دی گئی ہیں یا خود پھیل جاتی ہیں وہاں سے ان کو ہٹا کر ایک جامع سسٹم میں ٹھیک مقام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ خدا کا قانون اس لیے کہ وہ خدا کا قانون ہے اپنے قیام کی طاقت آپ اپنے اندر رکھتا ہے، اور یہ طاقت اس مومن کے نفس میں بھی موجود ہے جو خدا کی رضا چاہنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور خود اس کمال کا طالب ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو خدا کی طرف بڑھنے سے حاصل ہو، نیز یہ طاقت مومنین کی سوسائٹی اور اس صالح ریاست میں بھی موجود ہے جو خدا کے قانون پر مبنی ہو۔ قانون کی پابندی پر مومن کو آمادہ کرنے والی چیز اس کی خالص فرض شناسی بھی ہے، اُس کا حق کو حق جانتے ہوئے اسے پسند کرنا اور باطل کو باطل سمجھتے ہوئے اس سے نفرت کرنا بھی ہے، اور وہ طمع اور خوف بھی ہے جو وہ اپنے خدا سے رکھتا ہے۔

دیکھیے، اس طرح اسلام اُس پوری فکری اور عملی انارکی کو ختم کر دیتا ہے جو انسان کو بے خدا فرض کر کے اس کے لیے ایک نظامِ اخلاق تجویز کرنے کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد آگے چلیے۔ اسلام خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہی انسان کا اور ساری کائنات کا واحد مالک، خالق، معبود اور حاکم ہے۔ اس خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کے ہاں بجز دعائے خیر کے کسی ایسی سفارش کی گنجائش بھی نہیں جو زور سے منوائی جاتی ہو اور رد نہ کی جا سکتی ہو۔ اس کے ہاں ہر شخص کی کامیابی و ناکامی کا مدار اس کے اپنے طرزِ عمل پر ہے، نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے، نہ کسی کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالی جاتی ہے، اور نہ کسی کے عمل کا صلہ دوسرے کو ملتا ہے۔ اس کے ہاں جانبداری نہیں ایسی کہ ایک شخص یا خاندان یا قوم یا نسل سے اس کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی ہو۔ سب انسان اس کی نگاہ میں یکساں ہیں، سب کے لیے ایک ہی قانونِ اخلاق ہے، اور فضیلت جو کچھ بھی ہے اخلاقی فضیلت کے اعتبار سے ہے۔ وہ خود رحیم ہے اور رحم کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود فیاض ہے اور فیاضی کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود غفور ہے اور درگزر کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود عادل ہے اور عدل کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود ظلم سے، تنگ نظری و تنگ دلی سے، بے رحمی و سنگ دلی سے، تعصب اور نفسانی جانب داری سے پاک ہے اس لیے انہی کو پسند کرتا ہے جو ان صفات سے پاک ہوں۔ پھر کبریائی تنہا اسی کا حق ہے اس لیے تکبر اسے ناپسند ہے۔ خدائی صرف اس کے لیے ہے اور دوسرے اس کے بندے ہیں، اس لیے ایک بندے پر دوسرے کی خداوندی اس کو پسند نہیں۔ مالک وہ اکیلا ہے اور دوسروں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاس جو کچھ ہے امانت کی حیثیت سے ہے، اس لیے کسی بندے کی خود مختاری، اور کسی کا کسی کے لیے قانون بنانا، اور کسی کا کسی کے لیے بذاتِ خود واجب الاطاعت ہونا یہ سب فی الحقیقت غلط ہے۔ سب کا مطاع وہی ایک ہے اور سب کے لیے خیر اسی میں ہے کہ اس کی بے چون وچرا اطاعت کریں۔ پھر وہ محسن ہے اور شکر، احسان مندی اور محبت کا مستحق ہے۔ وہ منعم ہے اور اس کا حق دار ہے کہ اس کی نعمتوں میں اسی کے منشار کے مطابق تصرف کیا جائے۔ وہ منصف ہے اور لازم ہے کہ انسان اس کے انصاف میں سزا پانے کا خوف اور جزا پانے کی طمع رکھے۔ وہ علیم و خبیر ہے اور دلوں کی چھپی ہوئی نیتوں سے بھی واقف ہے اس لیے ظاہری حُسنِ اخلاق سے اس کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ وہ محیط ہے اس لیے کوئی یہ امید بھی نہیں کر سکتا کہ جرم کر کے اس کی پکڑ سے بچ نکلے گا۔

خدا کے اس تصور پر غور کیجیے، اس سے خود بخود ایک فطری نتیجہ کے طور پر انسان کے لیے ایک مکمل اخلاقی زندگی کا نقشہ وجود میں آتا ہے اور وہ نقشہ ان تمام کمزوریوں سے خالی ہے جو مشرکانہ مذاہب کے اخلاقیات اور دہریانہ مسلکوں کے اخلاقیات میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں نہ تو اخلاقی ذمہ داریوں سے بچ نکلنے کے لیے چور دروازے کہیں موجود ہیں، نہ ان ظالمانہ فلسفوں کے لیے کوئی جگہ ہے جن کی بنا پر انسان اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے عالمِ انسانیت کو تقسیم کر کے ایک حصہ کے لیے مجسم فرشتہ اور دوسرے حصہ کے لیے مجسم شیطان بن جاتا ہے۔ نہ دہری اخلاقیات کی وہ بنیادی کمزوریاں اس میں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اخلاق میں کوئی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان سلبی خوبیوں کے ساتھ اس نقشہ میں یہ ایجابی خوبی موجود ہے کہ یہ اخلاقی فضیلت کا ایک بلند ترین اور وسیع ترین منتہا پیش کرتا ہے جس کی وسعت اور بلندی کی کوئی حد نہیں، اور اس منتہا کی طرف بڑھنے کے لیے ایسے محرکات فراہم کرتا ہے جو پاکیزہ ترین ہیں۔

پھر یہ تصور کہ امتحان کسی ایک چیز میں نہیں بلکہ ان تمام چیزوں میں ہے جو خدا نے انسان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دی ہیں، کسی ایک حیثیت میں نہیں بلکہ ان تمام حیثیتوں میں ہے جو انسانوں کو یہاں حاصل ہیں، اور کسی ایک شعبہ میں نہیں بلکہ پوری زندگی میں ہے، یہ اخلاق کے دائرے کو اُتنا ہی پھیلا دیتا ہے جتنا امتحان کا دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ انسان کی عقل، اس کے ذرائع علم، اس کی ذہنی و فکری قوتیں، اس کے حواس، اس کے جذبات، اس کی خواہشات، اس کی جسمانی طاقتیں، سب کی سب امتحان میں شریک ہیں یعنی امتحان آدمی کی پوری شخصیت کا ہے۔ پھر خارج کی دنیا میں جن جن اشیاء سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے، جن اشیاء پر وہ تصرف کرتا ہے، جن انسانوں سے مختلف طور پر اس کو واسطہ پڑتا ہے، ان سب کے ساتھ اس کے برتاؤ میں امتحان ہے، اور سب سے بڑھ کر اس امر میں امتحان ہے کہ انسان یہ سب کچھ خدا کی خداوندی اور اپنی عبدیت و نیابت کے احساس کے ساتھ کر رہا ہے یا آزادی و خود مختاری کی ہوا میں مبتلا ہو کر؟ یا خدا کے سوا دوسروں کا بندہ بن کر؟ اس وسیع ترین تصورِ اخلاق میں وہ تنگی نہیں ہے جو مذہب کے محدود تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ آدمی کو زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھاتا ہے، ہر میدان کی اخلاقی ذمہ داریاں اسے بتاتا ہے، اور وہ اخلاقی اصول اسے دیتا ہے جن کی پیروی کرنے سے وہ خدا کے اُس امتحان میں کامیاب ہو سکے جو ایک ایک میدانِ زندگی سے متعلق ہے۔

پھر یہ تصور کہ امتحان کا اصلی اور آخری فیصلہ اس زندگی میں نہیں بلکہ دوسری زندگی میں ہوگا اور حقیقی کامیابی و ناکامی وہ ہے جو وہاں ہو نہ کہ یہاں، یہ دنیا کی زندگی اور اس کے معاملات پر انسان کی نظر (Out look) کو بنیادی طور پر بدل دیتا ہے۔ اس تصور کی وجہ سے وہ نتائج جو اس دنیا میں نکلتے ہیں ہمارے لیے حسن و قبح، صحت اور غلطی، حق اور باطل، اور کامیابی و ناکامی کے قطعی، اصلی اور آخری معیار نہیں رہتے، اس لیے قانونِ اخلاق کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا انحصار بھی ان نتائج پر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس تصور کو قبول کرے گا وہ قانونِ اخلاق کی پیروی بہر حال

© rasailojaraid.com

ثابت قدم رہے گا خواہ اس دنیا میں اس کا نتیجہ بظاہر اچھا ہو یا برا، کامیابی کی صورت میں نکلتا نظر آئے یا ناکامی کی صورت میں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی نگاہ میں دنیوی نتائج بالکل ہی ناقابلِ لحاظ ہوں گے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اصلی اور آخری لحاظ ان کا نہیں بلکہ آخرت کے پائدار نتائج کا کرے گا اور اپنے لیے صحیح صرف اُس طرزِ عمل کو سمجھے گا جو ان نتائج پر نگاہ رکھتے ہوئے اختیار کیا جائے۔ وہ کسی چیز کو چھوڑنے اور کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں کرے گا کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں وہ لذت اور خوشی اور نفع کی موجب ہے یا نہیں بلکہ اس بنیاد پر کرے گا کہ زندگی کے آخری مرحلہ میں اپنے قطعی و حتمی نتائج کے اعتبار سے وہ کیسی ہے۔ اس طرح اس کا نظام اخلاق ترقی پذیر تو ضرور رہے گا مگر اس کے اصولِ اخلاق تغیر پذیر نہ ہوں گے اور نہ اس کی سیرت ہی تلون پذیر ہوگی۔ یعنی تمدن و تہذیب کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اُس کے اخلاقی تصورات میں وسعت تو یقیناً ہوگی مگر یہ ممکن نہ ہوگا کہ واقعات کی ہر کروٹ اور حالات کی ہر گردش کے ساتھ اخلاق کے اصول بھی بدلتے چلے جائیں اور آدمی ایک اخلاقی گرگٹ بن کر رہ جائے کہ اس کے اخلاقی رویہ میں سرے سے کوئی پائداری ہی نہ ہو۔

پس اخلاق کے نقطۂ نظر سے آخرت کا یہ اسلامی تصور دو اہم فائدے عطا کرتا ہے جو کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک یہ کہ اس سے اصولِ اخلاق کو غایت درجہ کا استحکام نصیب ہوتا ہے جس میں تزلزل کا کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے انسان کی اخلاقی سیرت کو وہ استقامت میسر آتی ہے جس میں (بشرطِ ایمان) انحراف کا کوئی اندیشہ نہیں۔ دنیا میں سچائی کے دس مختلف نتیجے نکل سکتے ہیں اور ان نتائج پر نگاہ رکھنے والا ایک ابن الوقت انسان مواقع اور امکانات کے لحاظ سے دس مختلف طرزِ عمل اختیار کر سکتا ہے، لیکن آخرت میں سچائی کا نتیجہ لازماً ایک ہی ہے اور اس پر نظر رکھنے والا ایک مومن انسان دنیوی فائدے اور نقصان کا لحاظ کیے بغیر لازماً ایک ہی طرزِ عمل اختیار کرے گا۔ دنیوی نتائج کا اعتبار کیجیے تو خیر و شر کسی متعین چیز کا نام نہیں رہتا بلکہ ایک ہی چیز اپنے مختلف نتیجوں کے لحاظ سے

© rasailojaraid.com

کبھی خیر اور کبھی شر بنتی رہتی ہے اور اس کے اتباع میں دنیا پرست آدمی کا کردار بھی اپنی پوزیشن تبدیل کرتا رہتا ہے، لیکن آخرت کے نتائج پر نظر رکھیے تو خیر اور شر دونوں قطعی طور پر متعین ہو جاتے ہیں اور مومن بالآخرۃ آدمی کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ کبھی خیر کو بد انجام یا شر کو نیک انجام سمجھ کر اپنے کردار کو بدل دے۔

پھر یہ تصور کہ انسان اس دنیا میں خدا کا خلیفہ ہے اور تصرف کے جو اختیارات یہاں اسے حاصل ہیں وہ سب دراصل نائب خدا ہونے کی حیثیت سے ہیں، انسانی زندگی کے لیے راستے اور مقصد دونوں کا تعین کر دیتا ہے۔ اس تصور سے لازم آتا ہے کہ انسان کے لیے خود مختاری اور بندگی غیر اور خداوندانہ بڑائی کے تمام رویے غلط ہوں اور صرف یہی ایک رویہ صحیح ہو کہ اپنے تمام تصرفات میں وہ خدا کی مرضی کا تابع اور اس کے نازل کردہ اخلاقی قانون (Moral law) کا پابند بن کر رہے۔ نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان ایک طرف تو اپنے اخلاقی رویہ میں ہر ایسے طرز عمل سے بشدت اجتناب کرے جس میں خود مختاری و بغاوت کا، یا خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا، یا خداوندانہ کبریائی کا ذرہ برابر شائبہ پایا جاتا ہو، کیونکہ یہ تینوں چیزیں اس کی نائبانہ حیثیت کے منافی ہیں، مگر دوسری طرف خدا کی املاک میں اس کا تصرف اور خدا کی پیدا کردہ قوتوں میں اس کا برتاؤ، اور خدا کی رعیت میں اس کی فرماں روائی اس اخلاق اور اس برتاؤ کے عین مطابق ہو جو اس سلطنت کا اصل مالک اپنے ملک اور اپنی رعیت میں اختیار کر رہا ہے، کیونکہ نائبانہ حیثیت کا فطری اقتضا یہی ہے کہ نائب سلطان کی پالیسی خود سلطان کی پالیسی سے اور نائب سلطان کے اخلاق خود سلطان کے اخلاق سے منافی نہ ہوں۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو قوتیں اللہ نے انسان کو عطا کی ہیں اور جو ذرائع اور وسائل اسے دنیا میں بخشے ہیں ان سب کو استعمال کرنے اور منشاء الٰہی کے مطابق استعمال کرنے پر انسان مامور ہو۔ ایسی دوسرے الفاظ میں وہ نائب سلطان بھی سخت مجرم ہو جس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سلطان کے منشاء کے خلاف اُس کی ملک اور اس کی رعیت میں تصرف کیا، اور اسی طرح وہ نائب بھی بڑا مجرم قرار پائے جس نے سلطان کے دیے ہوئے اختیارات میں سے کسی اختیار کو سرے سے استعمال ہی نہ کیا، اس کی بخشی ہوئی قوتوں میں سے کسی قوت کو بلاوجہ ضائع کیا، اس کے دیے ہوئے ذرائع و وسائل سے کام لینے میں جان بوجھ کر کوتاہی کی، اور اس ڈیوٹی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا جس پر سلطان نے اسے مامور کیا تھا۔ نیز اس تصور سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ پوری نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی ایسے ڈھنگ پر قائم ہو کہ سارے انسان، یعنی خدا کے سب خلیفہ اُن ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں، جو خدا نے اُن پر عائد کی ہیں، ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں اور نظامِ تمدن و عمران میں ایسی کوئی چیز کارفرما نہ رہے جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کی، یا انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کی خلافت کو عملاً سلب کر لے یا اس کے اجراء میں مانع و مزاحم ہو، بجز اُس صورت کے جبکہ کوئی انسان یا گروہِ انسانی خلافت سے منحرف ہو کر اپنے حقیقی سلطان سے بغاوت کا مرتکب ہو رہا ہو۔

یہ تو ہے وہ اخلاقی منہاج جو تصورِ خلافت سے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر انسان کے لیے متعین ہے۔ رہا انسان کی اخلاقی زندگی کا مقصد اور اس کی تمام سعی و عمل کا نصب العین، تو وہ بھی اسی تصور سے بالکل ایک منطقی لزوم کے ساتھ متعین ہوتا ہے۔ نائب سلطان کی حیثیت سے انسان کا زمین پر مامور ہونا خود بخود اس بات کا مقتضی ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ خدا نے زمین کے انتظام کا جتنا حصہ انسان سے متعلق کیا ہے اس حصہ میں خدا کے قانون کو جاری کرنا، خدا کے منشاء کے مطابق امن اور عدل اور صلاح کا نظام قائم کرنا اور قائم رکھنا، اس نظام میں شر و فساد کی جو جو صورتیں شیاطین جن و انس پیدا کریں ان کو دبانا اور مٹانا، اور اُن بھلائیوں کو زیادہ سے زیادہ نشوونما دینا جو خدا کو محبوب ہیں اور جن سے خداوند عالم اپنی زمین اور اپنی رعیت کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، یہ ہے وہ مقصد جس پر ہر وہ انسان اپنی تمام مساعی کو مرکوز کر دے گا جس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اندر خلیفۂ الٰہی ہونے کا شعور بیدار ہو چکا ہو۔ یہ مقصد صرف یہی نہیں کہ ان تمام مقاصد کی نفی کر دیتا ہے جو لذت پرستوں اور مادہ پرستوں اور قوم پرستوں اور دوسرے جہلات کے پرستاروں نے اپنی زندگی کے لیے مقرر کیے ہیں، بلکہ یہ اُن لایعنی مقاصد کی بھی اتنی ہی شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے جو روحانیت کے ایک غلط تصور کے تحت اہلِ مذاہب نے متعین کیے ہیں۔ ان دونوں غلط انتہاؤں کے درمیان خلافت الٰہیہ کا تصور انسان کے سامنے ایک ایسا بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصدِ حیات رکھ دیتا ہے جو اُس کی ساری قوتوں اور قابلیتوں کو زندگی کے ہر میدان میں برسرِ کار لاتا ہے اور انہیں ایک صالح ترین نظامِ تہذیب و تمدن کے قیام و ارتقار کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ بنیادیں جو اخلاقِ انسانی کی تعمیر کے لیے اسلام نے ہم کو دی ہیں۔ اسلام کسی ایک قوم کی جائداد نہیں بلکہ تمام انسانیت کی مشترک میراث ہے اور سارے انسانوں کی فلاح اس کے پیشِ نظر ہے اس لیے ہر اُس شخص کو جو اپنی اور انسانیت کی فلاح کا خواہشمند ہو، یہ سوچنا چاہیے کہ آیا انسانی اخلاق کی تعمیر کے لیے یہ بنیادیں بہتر ہیں جو اسلام ہمیں دے رہا ہے یا وہ جو روحانی مذاہب یا فلسفیانہ مسالک ہم کو دیتے ہیں؟ اگر کسی کا دل گواہی دے کہ اخلاق کے لیے یہی بنیادیں صحیح تر ہیں تو پھر کوئی جاہلانہ تعصب ہی اسے ان بنیادوں کے قبول کر لینے میں مانع نہ ہونا چاہیے۔

اطلاع

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی جملہ تصانیف "سلیمان بُک ڈپو۔ صدر بازار، کپورتھلہ" سے بھی مل سکتی ہیں

© rasailojaraid.com